۷۸۶ ھو الکل یا معین

غدر دہلی کے افسانوں کا

گیارھواں حصّہ

دہلی کی آخری شمع

از جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے

مصنّف کی اجازت سے شائع کیا

اور

ابن عربی کارکن حلقۂ مشائخ دہلی نے بماہ مئی سنہ ۱۹۲۸ء

پہلی بار ریاست برقی پریس دہلی میں چھپوایا

طبع اوّل قیمت ۱۲؍

۱۸۵۷ء

غدر دہلی

غدر دہلی کے افسانوں کا پہلا حصہ

بیگمات کے آنسو

یہ وہ مشہور کتاب ہے جس کو خواجہ صاحب کی تصنیفات میں ماسٹر پیس یا اعلیٰ درجہ کی تصنیف کہا جاتا ہے ایک سو بہتر (۱۷۲) صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی صاف ہے۔ کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجہ کی۔ ٹائیٹل یعنی سرورق نہایت خوبصورت اور رنگین ہے یعنی کئی رنگ میں چھاپا گیا ہے ۹ دفعہ چھپ چکی ہے۔ تازہ ایڈیشن میں نئے افسانے بڑھائے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/ ۱) ..

غدر دہلی کے افسانوں کا دوسرا حصہ

انگریزوں کی بپتا

جس میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کی ان مصیبتوں کا حال ہے جو ان کو غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں۔ ضخامت ۱۲۴ صفحے۔ لکھائی۔ چھپائی نہایت اعلیٰ۔ کاغذ بہت دبیز اور عمدہ۔ تین دفعہ چھپی ہے۔ اس میں ۱۳ افسانے ہیں۔ یعنی تیرہ انگریز مرد اور عورتوں نے اپنی کیفیت خود لکھی ہے بہت دردناک اور مؤثر ہے از حضرت خواجہ صاحب۔ قیمت آٹھ آنہ (۸/) ..

غدر دہلی کے افسانوں کا تیسرا حصہ

"محاصرۂ دہلی کے خطوط"

اس میں ان خطوط کا ترجمہ شائع ہوا ہے جو انگریزی فوج کے افسروں نے دہلی کے محاصرہ کے وقت پنجاب کے انگریز افسروں کو بھیجے تھے۔ ان خطوط میں بعض نہایت دلچسپ اور مخفی اور تاریخی مراسلات بھی ہیں۔ ضخامت ۳۲ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھا۔ کل تیرہ مراسلے اس کے اندر ہیں۔ از حضرت خواجہ صاحب قیمت چار آنے (۴/) ..

غدر دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصہ

بہادر شاہ کا مقدمہ

یہ دو سو اسی (۲۸۰) صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ یہ غدر دہلی کے حالات میں نہایت دردناک کتاب ہے۔ اس میں اس مشہور مقدمہ کا حال ہے

۷۸۶ ھوالکل یامعین

غدر دہلی کے افسانوں کا گیارھواں حصہ

دہلی کی آخری شمع

حسن نظامی کا دیباچہ

سدا رہے نام اللہ کا۔ دنیا کے طلسم خانہ میں کون رہا ہے جو دلّی کی شان رہ جاتی۔ اور کون جانتا ہے کہ دلّی اجڑنے کے بعد لندن کی آبادی نمودار ہوئی تو یہ آبادی کب تک قائم رہیگی۔ اور کونسا انگریز حسن نظامی کی طرح ٹیمز دریا کے کنارہ بیٹھ کر لندن کی ختم شدہ شان کے افسانے لکھا کرے گا۔

میں نے دہلی کی بربادیاں دیکھیں، آبادیاں دیکھنے کا وقت نہ ملا کہ میری پیدائش سے برسوں پہلے ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے ماں باپ نے اور نانا نانی نے بادشاہ اور ان کے خاندان کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا اور قلعہ میں مہمان بنکر مغلوں کی آخری بہار کی سیر کی تھی۔ اور پھر انھوں نے ان سب کا بگڑنا اور بکھرنا اور دربدر خاک بسر ہونا بھی دیکھا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو رات دن یہی غمگین کرنے والی کہانیاں سُنیں۔ اور دل پر ان کہانیوں نے ایسے نقش کیے کہ آج اکیاون سال

کی عمر میں بھی وہ باتیں کانوں میں گونجا کرتی ہیں۔

لکھنے کا زمانہ آیا تو دل کے اثرات نے سب سے زیادہ دہلی اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات پر متوجہ رکھا۔ پہلا مضمون بہادر شاہ کے خاندان کی نسبت چھپا تو ملک میں دھوم مچ گئی۔ میں سمجھا یہ میدان لکھنے کے لئے ایسا ہی عمدہ ہے جیسا شاعری کے لیئے تصوف سب سے اچھا میدان ہے۔

پھر تو ایک کتاب شائع ہو گئی۔ اور لوگوں نے انگریز سرکار کو اسکے خلاف بدگمان بھی کرنا چاہا مگر سرکار نیت کو دیکھتی تھی کہ میں عبرت کی تاریخ لکھتا ہوں۔ انقلاب کے مقصد سے میرا کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

پھر اس سلسلہ کا دوسرا تیسرا یہاں تک کہ دسواں حصہ بھی شائع ہو گیا اب میں نے خیال کیا کہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ اس کے بعد کچھ باقی نہیں ہے جسکو لکھوں۔ ہاں شاہی خاندان کے کسی فرد کا کوئی قصہ مل جاتا تو اس کو نمک مرچ لگا کر کسی رسالہ میں چھپوا دیتا تھا۔

یکایک جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی رجسٹرار ہائی کورٹ حیدرآباد کا ایک مضمون دہلی کے ایک مشاعرہ کی نسبت نظر آیا جو رسالہ اردو اور رسالہ الناظر اور کتاب مضامین فرحت میں شائع ہوا تھا۔

وہ مضمون میرے دوست ملا واحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی نے سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ ان کا خاندان شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ سے دہلی میں ہے، اور اس کے تعلقات قلعہ سے ہمیشہ رہے تھے اسلیئے ان پر دہلی کے اس مشاعرہ نے بڑا اثر کیا۔ اور میں نے ان کے کہنے سے تمام و کمال مضمون پڑھا۔ حالانکہ میں آجکل کام کی کثرت کے سبب اکثر مضامین کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں۔

جب میں نے اسکو پڑھا تو فوراً انگریزی اخبار ریئنگ مسلم دہلی کے ایڈیٹر صاحب سے کہا کہ اس مضمون کا ترجمہ کیجئے تاکہ یورپ و امریکہ کو بھی دہلی کی آخری شمع کی روشنی نظر آسکے۔

اس کے بعد میں نے میرزا فرحت صاحب کو اپنے عزیز دوست مولوی مظہراللہ نظامی کے ذریعہ خط لکھا کہ وہ مجھکو یہ مضمون بصورت کتاب شائع کرنے کی اجازت دیں میرزا صاحب نے جواب دیا اور ایسا جواب جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری خواہش کے قدردان ہیں۔ ان کی اجازت حاصل ہوتے ہی میں نے اس مضمون کا نام "دہلی کی آخری شمع" مشاعرہ کی رعایت سے رکھدیا اور چھپوانے کی تیاری ہونے لگی۔

دہلی کے مصوروں کو تلاش کیا کہ ان میں کوئی ایسا نکلے جو میرزا فرحت کے لفظی مرقعوں سے تصویریں بنا دے اور میں ان کو کتاب میں درج کردوں۔ مگر اب تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

خدا کا نام لیکر کتاب کاتب کو دیتا ہوں۔ تصویریں مل جائینگی یا بن جائینگی تو ان کو بھی شریک کردونگا ورنہ میرزا فرحت نے مصوری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ صورتیں دکھانے، لباس بتانے، اور بول چال، رنگ ڈھنگ کی نقل اُتارنے میں کمال کردیا ہے، مصور سے یہ بات نہ ہوسکتی جو الفاظ کی تصویروں نے اس مضمون میں پیدا کردی ہے۔

میں چاہتا تھا کہ اس مضمون پر ایسا دیباچہ لکھوں کہ اس کی ہر خوبی پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے مگر ایک مہینہ سے غم والم کے پہاڑ کے نیچے دبا پڑا ہوں ۲۳ جنوری ۱۹۲۸ء کی شام کو مجھپر کسی ظالم نے پستول چلایا اور جی بھر کر گولیاں ماریں میرا چہرہ اور سینہ اسکے سامنے تھا اور وہ نشانہ باندھ کر فیر کررہا تھا مگر کمبخت گولیاں نشانہ بازی کی حریف تھیں، ایک گولی نے بھی نامِل کا ساتھ نہ دیا اور کوئی گولی میرے نہ لگی، البتہ میرے

بوڑھے خسر پیرزادہ سید محمد صادق کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ان کے گولی لگی اور وہ پون گھنٹہ خاک و خون میں لوٹ لوٹ کر ختم ہو گئے۔

آج فروری ۱۹۲۸ء کی ۲۹ تاریخ ہے۔ گویا پورا ایک مہینہ ہو گیا لیکن خواجہ بانو کا غم پہلی گھڑی کی طرح تازہ ہے، ان کے تو وہ باپ تھے۔ اور میرے بچوں کے نانا تھے۔ مگر میرے گھر کا بیان ہے کہ وہ اس کے بھی باپ تھے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرے ماموں زاد بھائی بھی تھے، اور میرے بچپن سے آج تک سرپرست بھی تھے اور اب بارہ تیرہ سال سے خسر بھی تھے۔

جنگل میں اکیلا گھر، دشمنوں کی قتل کے بعد بھی رات دن کی دھمکیاں، پولس کے عجیب و غریب حالات، دماغ قابو میں نہیں ہے اور دل تو شہید کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔

ایسی حالت میں کیا دیباچہ لکھوں اور کہاں سے وہ جذبہ لاؤں جو میرزا فرحت کے کمالات کی ترجمانی کر سکے۔

آخری بات یہ ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل خود ہی سمجھ لیگا کہ میرزا فرحت نے دہلی کی اس شمع کی زیارت کرا دی ہے جو مسلمانوں کی گذشتہ رات کو محفل کی رونق بڑھا رہی تھی اور مرنے والی قوم کی مٹنے والی تہذیب کو دکھا رہی تھی، اور جس نے صبح کے قریب روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے ایک آہ کی تھی اور ایک آہ کے ساتھ اس کا شعلہ بجھ کر اور دھواں بنکر اڑ گیا تھا۔

میں دہلی شہر کے اندر اس کتاب کو شائع کر رہا ہوں وہی دہلی جسکے مشاعرہ کا اس کتاب میں بیان ہے۔ مگر نہیں یہ تو خواب کا بیان ہے، وہ دہلی اب کہاں ہے جسکی گردش شمع کا یہ افسانہ ہے۔ اب تو نہ کوئی شمع باقی ہے نہ کوئی پروانہ ہے۔

حسن نظامی۔ دہلی۔ ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱)

تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم انسان "ایک محشر خیال" ہے۔ لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اُردو کے حالات پڑھنے اور سُننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو اُن کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی، اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ پُرانے قدیم کاغذات میں مجھکو حکیم مومن خاں 'مومن' دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر اُن لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف اُن کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں فقط

رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش نظر کردیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا - اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے، دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے - قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے - اُردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا، بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اُسمیں قلعہ کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا برخلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہ رہی تھی، پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی اور اُس "اُجڑے دیار" میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جسکی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے -

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن میں سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا، جسکو جہاں کچھ سہارا ملا، وہیں کا ہو رہا - دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رامپور آباد ہوئے - اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی - جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں - اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے، کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہیگا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا، جسطرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم کہ اُن کی قبر کہاں ہے -

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اردو" کے لیے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جسکی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے اُن محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور اُن کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم اُن کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل وصورت، حرکات وسکنات، آواز کی کیفیت، نشست وبرخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اُس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنّف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اسکی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سُننے سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جسکے شروع میں اُس کے حالات درج نہ کیئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو اُن کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں، بہت سے ایسے مرقعے پائینگے جو دوسرے مصوّروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے نقش ونگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اُتارے گئے ہیں، اکثر وبیشتر ایسی صورتیں ہونگی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں، لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے

مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اُس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بنکر بے لطف ہو جاتا، لیکن اِدھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ اُدھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ ہجری کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اسکی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ ۱۲۶۱ھ ہجری کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　　ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصّہ لیا تھا جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اسکو اتنی وسعت دی ہے کہ اُس زمانہ کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دیجائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے۔ جو اُن سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے

ہیں۔" ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگانِ خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزمِ ادبِ اُردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیے "میں" اب "مولوی کریم الدین صاحب" کی جون میں حاضرِ خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیے، مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل بھر کر کہیے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے، میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۳۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے، مولویوں کا خاندان تھا، لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے، جائداد ضبط ہو گئی، میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گذار دی۔ جب ضبط شدہ جائداد کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے اُن کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اُٹھے۔ میں سنہ ۱۲۳۳ھ میں عین عیدالفطر کے دن پیدا ہوا

میری تعلیم ابھی دو بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی لیکن بے چین طبیعت اور خانذانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا۔ اُس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔" ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی آگیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا، محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقۂ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانہ میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہوگیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا، اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی، لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیئے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارہ کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لیئے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے، لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کرکے شعراء کے حالات اور اُن کا کلام طبع کروں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں، کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لیئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہوگئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ

ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو مُنہ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان بھی تو مولویوں سے۔ وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں، عارف، پر نظر پڑی اُن سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں، لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اُس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے، گوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے، ٹھڈّی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے، بہر حال اُن کی محبت، اُن کی شرافت، اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازہ پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ اُنھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے، ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے، سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے، میں نے تو اُن کو پہچانا بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی، کہنے لگے "مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا، علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا لی ہے

ہیں، مگر یہ تو کہیئے آج آپ کدھر نکل آئے۔" میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی، تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ایک آہ بھر کر کہا۔" میاں کریم الدین! تم کو بات تو اچھی سوجھی ہے، مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں۔ دل تو میرا ابھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جسمیں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے ہاں ٹھہرو، حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے، اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائیگی اور تمھارا بھی کام نکل جائیگا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ، اُس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے، فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجالایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور نواب صاحب سے کہا، آپ کی تعریف کیجئے۔" اُنھوں نے کہا " یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُن کے حُلیئے اور اُن کے کلام کے نمونے دکھائیں۔ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پُرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔" حکیم صاحب کہنے لگے " میاں عارف خدا کے لیئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو، انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائیگی، اور تمہیں مرض ہی کیا ہے، وہم

ہی وہم ہے، مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کر دو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو، میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی، میں اُن کو سب کچھ سمجھا دونگا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرے کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں اور اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے، اب رہا مشاعرے کا انتظام وہ میں خود کر لونگا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں۔" حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے۔ پھر کہا "عارف! تمہارے لیئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لیئے اور بھی کرونگا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر[۱] سے ملا دیتا ہوں۔ اُن کو آجکل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعۂ معلّی میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں، یہ اندر پہنچا دیگا۔ آگے آپ جانیں اور آپکی قسمت" یہ کہکر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی، وہ آیا تو اُس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی[۲] میں

---

[۱] ان کا نام مرزا فخر الدین، خطاب مرزا فتح الملک، شاہ بہادر، عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔

[۲] قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی کو بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمن احسان کا شعر ہے کہ

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں — بہادر شاہ غازی کی دوہائی ہے دوہائی ہے

ایک بجے آئینگے، ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا" یہ کہکر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہوگئے اور میں آداب کرکے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلّٰی پہنچا۔ لاہوری دروازہ کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانے میں "نشست" کہا جاتا تھا، دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر بولے۔ اجی مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا؛ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لیئے لیتا ہوں، مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ بھی آسکیں، خیر بیٹھیئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا،" وہ کریم الدین کون صاحب ہیں اُن کو حضور والا یاد فرماتے ہیں"۔ یہ سُننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا؛ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہوگی، اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہوگا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا۔ آنکھ اُٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لیئے جا رہا ہے اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا، اب جو موقعہ ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندھ آگئی۔ آخر خدا خدا کرکے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اُس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ تین صاحبوں

نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی؟ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں، ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے، وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں، ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں، مگر اوّل تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا۔ دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آکر کہا کہ "چلیے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پاؤں ڈالتا، حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے" نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجا لاؤ" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دُہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا، حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے، پائینتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی، لمبی گردن چوکا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، سر منڈا ہوا،

چھدری داڑھی، کلوں پر بہت کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، لبیں کتری ہوئی۔ (۷۰) برس سے اونچی عمر تھی، بال سفید بھک ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی داڑھی میں اکّا دُکّا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جُھریاں تھیں، لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک بر کا پیجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کُرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی، فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے، یہ جوان۔ اُن کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا، ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ اُن کی داڑھی سفید تھی، ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا "اماںؔ[۵] تمھارا ہی نام کریم الدین ہے! تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو؟" میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے حضرت ظلّ اللّٰہ کے سائۂ عاطفت میں آ رہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی تمھارا ہی

[۵] قلعۂ دہلی کے دورِ آخر میں شاہانِ دہلی بعض وقت مرد عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس پُرانے طرزِ کلام کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے، مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقۂ مخاطبت کی بنا پر قلعۂ معلّی کی تہذیب اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ انکو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پُتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں اُنکے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں۔ اڈیٹر رسالہ اُردو)

تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں۔ زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب نہیں معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا؛ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسے میں مشاعرہ شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالوگے۔ استاد ذوق تو بچارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑ مرینگے۔ اور تم جانتے ہو" اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا" کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمے لیا ہے۔" فرمایا" تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہشیار اور ذہین ہے، مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا، رہے استاد ذوق ان سے میں کہدونگا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیجدونگا اور انشاءاللہ اپنی غزل بھی بھیجونگا۔ ہاں

یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے؟ "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے
یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی "اے ہے
یہ اتنا بچہ کو کیا بے طرح سلاگئی ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی
یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس
شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ نہ لینا
ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی پیرو مرشد تاریخ؟ "فرمایا" ۱۴ رجب مقرر
کردو۔ دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہو گی، آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی
ہیں؛ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی ۲۰ جولائی پڑےگی
موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ" میں نے عمر و دولت و اقبال
کو دعا دی اور خوش خوش اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں
نہیں بولے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انھیں کا ہے، ورنہ کہاں میں اور کہاں
یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے " بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں
اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنی مشکل نہ تھی جتنا رخصت ہو کر یہ اُلٹے
پانوں چلنا ہوا۔ زمین پانوں کو نہیں لگی تھی، اسلیئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ
پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پانوں جا پڑا۔
خیر بہزار مشکل اس جادۂ ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا،
اُدھر چوبدار ساتھ ہوا اس کو انعام دے دلا کر ٹالا، حکیم صاحب کے پاس آیا،
وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ اُن سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے۔
"مولوی صاحب! بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لیئے
بے چین ہو رہے تھے، اُنھیں کی یہ کارگزاری ہے، ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح
تھوڑی طے ہوتا، مگر چلو تمھارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جا کر کہدو

وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کیے۔ کہنے لگے کہ "چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو، مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں، اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمھارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو، مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی "اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آ جاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انھیں کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا دیکھیے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوا سو روپے اٹھ جائینگے۔" یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین۔ تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے ہزار دو ہزار میں بھی اگر یہ پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سنکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا "نواب صاحب! اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے، مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو خدا یہ مشکل بھی آسان کر دیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں

اور میرا کام جائے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ لو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور رسوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو، ذرا آرام لے لو۔ اور کل صبح ہی سے اِدھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو، اُدھر ان تینوں اُستادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے، آخر میرے ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہوگئی۔ صبح اُٹھکر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے اُستاد ذوق ہی سے بسم اللہ کردوں۔

کابلی دروازہ کے پاس ہی اِن کا مکان ہے، مکان بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے، اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیئے مشکل سے جگہ رہتی ہے سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اسکے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو اُستاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے۔

دوسری چارپائی پر اُن کے چاہتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں اور اِنھی سے ہوشیار رہنے کے لیئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اُستادِ ذوق قد وقامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں، چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پیجامہ، سفید کُرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی

گول چبندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پانوں کی آہٹ سُنتے ہی
حافظ ویرآن نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا "کریم الدین، اُستاد
ذوؔق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔ اُستاد نے اپنا نام سُنکر کہا۔
"آئیے آئیے، اندر تشریف لائیے"۔ میں نے آداب کیا۔ اُنھوں نے فرمایا
"بیٹھو، بھئی بیٹھو"۔ میں حافظ ویرآن کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا
"فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے
حوض پہ ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے
اگر حضور بھی از راہ ذرّہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا"۔ میرا
اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویرآن تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جائیے جائیے، کہاں کا
مشاعرہ نکالا ہے؛ اُستاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا لے پالک[۱] کے
پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو"۔ اُستاد نے کہا
"بھئی حافظ ویرآن! تمھاری زبان نہیں رُکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے
لڑائی مول لیتے ہو"۔ حافظ ویرآن کہنے لگے "اُستاد، جب وہ آپ کو بُرا
بھلا کہیں تو ہم کیوں چُپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہینگے تو ہم سو سنائینگے۔ اور تو
اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں، کل ہی کی بات ہے آپ کو ناوڑا کہہ رہے تھے
مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کرینگے اُن کی سات پشت کو تو م ڈالا"۔
اُستاد ہنسکر فرمانے لگے "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو

[۱] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اُڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں
ہیں بلکہ مُنھوں نے انکو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ
رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اُسکے حسب نسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے۔ اُستاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے، یہ
دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے انکے ہاتھ میں اُسترے کی بجائے تلوار دیکر اُن کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

مجھے جسکا جو جی چاہے سو کہے۔ میں نے تو ان سب کا جواب ایک باعی میں دیدیا ہے

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے اسکے تو بُرا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرہ کی عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوقؔ بھی کہدینگے وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئینگے"۔ یہ سُنکر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ اُستاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آوں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے؟" میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے"۔ اُستاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے۔ مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ "اللہ خیر کرے، دیکھئے اُس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشقلے[1] چھوڑا کرتے ہیں" وہ اپنی کہے گئے میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا، چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلّی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے بائیں طرف پہلا ہی مکان اُن کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو[2] دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان

[1] معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہے مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

یں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے
کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا
صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے
گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو
اندر کے دالان میں گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۶۰ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں، قد
اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے۔ لیکن
اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے
آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔
سر منڈا ہوا، اُس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے،
ایک برکا سفید پیجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اُس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا
چغہ[1]۔ میری آہٹ پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا، سلام کا جواب
دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا
کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو
کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں، اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں،
کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے
رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ
کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں،
چُگّی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید
پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی

---

[1] قلعہ دہلی کے عجائب خانے میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے۔ اس سے یہ لباس کہا گیا ہے۔

ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُنھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے، پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے "ہیں میاں نیر" تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں" فرمانے لگے "حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا، کل ہی میاں عارف آ کر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیرؔ! تم بھی چلوگے؟" نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لیجائینگے تو انشاءاللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہونگا" مرزا صاحب نے پوچھا "مگر بھئی اب تک "علائی" نہیں آئے۔ مجھکو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو! وہ آ ہی گئے بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔"

نواب علاءالدین خاں علائی، نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی، وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کی تعریف؟" مرزا نوشہ نے تمام قصہ

بیان کیا اور کہا "علائی! تم کو بھی چلنا ہوگا۔ ابھی تو شاید لوہارو نہیں جارہے ہو" اُنھوں نے کہا "بہت خوب آپ تشریف لے جائینگے تو میں بھی حاضر ہوں"۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ اُنھوں نے مردانے کا ایک حصّہ میرے لیئے خالی کردیا تھا، جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اُسکو جما جمایا پایا، کپڑے اُتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب 'صہبائی' مل گئے۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں، کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، مُنہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں، بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک بر کا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبّہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ ہی میں رہتے ہیں، مجھ سے پوچھنے لگے۔ "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے پاس"۔ پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جارہا ہوں" حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان، پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کردیا ہے، لیکن مُنڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[1]۔ دالانوں

---

[1] میں نے خود یہ مکان ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا، ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا، تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی، سامنے کا حصّہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی مُنڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی مُنڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گر پڑے۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے اُن کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی "دست و بازو بشکست"

میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ 'رقم' اور مرزا رحیم الدین 'حیا' مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے، سرخ و سفید رنگ تھا جسمیں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنوئیں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی موچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی اُنگلیاں، سر پر گھونگروالے لمبے لمبے بال زلفیں بنکر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں، کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑکر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا، لیکن اُس کے نیچے کُرتہ نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اسمیں چھوٹا سا سُنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اسکے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پیجامہ، مہریوں پر سے تنگ اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹا کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کناروں پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ

نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین، حیا، سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم! تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں، دو ہوں، آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔" صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں۔ رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کر کے اُن کے پاس بھیجدیتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں۔" حکیم صاحب نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لیکر کہا "بیٹھیے بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے۔ اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہوگی میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہوگی، تم بساط بچھاؤ۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کرلوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی، اسکا جوڑا آئے پر آئے۔" سکھانند حکیم تھے، رقم تخلص کرتے تھے، دھرم پورے میں رہتے تھے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی، ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے، بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے، حکیم صاحب کی باتیں سُنکر "بہت خوب، بہت مناسب" کہتے رہے اُن سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "اے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے۔ اور آپ کے ساتھ یہ صاحب

کون ہیں ؟" مولوی صہبائی نے کہا " یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں" حکیم صاحب نے ہنسکر کہا " بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں[1]۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را — تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہُد ہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں اپنے نا اہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر یہ کہ

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں — ناخنِ قوسِ قزح، شبہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب[2] تو اُن کی بات دوسری ہے وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ " اس مشاعرے میں اُستاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئیگی" فرمایا، ہر شخص مختار ہے، چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے، میں تو نہ آؤنگا نہ غزل بھیجونگا" یہ باتیں

---

[1] یہ اُستاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

[2] ان کا مفصل حال آگے آئیگا۔ یہ بھی عجیب مجسم تھے۔

ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لیکر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اِن کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آکر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اُس سے آملی۔ اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے[1] ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا "کہو میاں رقم، تم نے دیکھا"۔ اُنھوں نے کہا "جی ہاں، ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں"۔ کہنے لگے "اسکا خیال نہ کرو، انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی، مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے"۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے، وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اُن کو اب زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے"۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب

[1] یہ واقعہ ہے۔ اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سُنا ہے۔

بڑے غور سے میری بات سُنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے " افسوس ہے، کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔" میری طرف دیکھ کر کہا " اچھا بھئی، تم جاؤ، میری طرف سے عارف سے کہدینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا " نواب صاحب نے " نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی" حکیم صاحب کہنے لگے " میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کہدینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا؟ اور 'طرح' کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے " ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کی جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو، نہ شعر کہنے میں جی لگتا اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہکر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا، اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک

ہی جلد [illegible] کر اندر گیا، مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے، انگریزی اور
ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے، صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اسمیں
مختصر سی نہر ہے، سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے
ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے
ہوئے تھے، اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تختوں
پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر
کوئی ۶۵، ۷۰ سال کی تھی، گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا
اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی
ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، بدن میں سفید ایک بر کا پیجامہ،
سفید کُرتہ اور سفید ہی عمامہ تھا[1]۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں
نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا، اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک
نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اُس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی
تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا، لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا
تنگ مہری کا سفید پیجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما
پچگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

[1] پُرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے زنانے میں جانے کے خاص خاص
وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس
بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا، شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت
بیکار نہ گذرتا، خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے
دیے رہتے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات
کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے، کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیے، کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور
بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں! خانصاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں"۔ میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سُنکر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہدینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے"۔ یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب حال بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سُننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اُن کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا، صرف آپ کی وجہ سے اُنھوں نے یہ عہد توڑا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا "میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اسکو جانے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں"۔ فرمایا "نہیں بھئی، نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے ملکر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو، بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں، تم نے آکر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دُہری تہری محنت پڑ جائے گی۔

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفدار کے ترجمہ میں ایسا گُتھ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی۔ اس لیے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ بھائی رجب کو شام کو ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں، کوئی کہتا کہ ہس سے کیا کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سُنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے صدر دروازہ سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

چاروں طرف دیکھا اور کہتا " واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا؛ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ! واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار ہیں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا" چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے درو دیوار پڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے، تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اُس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں دیوارگیریوں، قمقموں، چینی، قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شئے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگاجمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اسکے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز[1] کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے، اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے، اس سرے سے اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی، چھت گیری کے بیچوں

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری سی بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا، کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں، دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے، باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے، تمام مکان مشک عنبر اور اگر کی خوشبو سے بڑا مہک رہا تھا، قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اٹھا لائے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر اُن پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک نہ پھولوں کی آگئی تھی، خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بُن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا، میں تو الف لیلہ کا ابوالحسن ہوگیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی[1] میں اس تماشہ میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں، استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دنگل فصل

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال سنا ہو بجنسہ اسی پر اس مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے۔

نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے"۔ انھوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہ چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا، لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند۔ جب تک سب چلے نہ گئے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما، تو یہ بھی اُٹھے مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا، کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا لیتھڑے تھے، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے؛ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا، جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو"۔ آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپئے مار لاتا، مگر انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی؛ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لپ فرش اُن کو لیا اور پوچھا۔ ہیں صاحبِ عالم! میاں حیا، آپ کے ساتھ نہیں آئے"۔ مرزا رحیم الدین حیا، ان کے بڑے بیٹے ہیں؛ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی

نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا آنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے "نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے، جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت[ل] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے، اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ اُستاد ماننا درکنار مجھکو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں ہاں بھئی کیوں نہو، تیرھویں صدی ہے، ان کو بنارس بھیجکر میں تو مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ، دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی۔" یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا، کو لے جا ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ نہوے تھے کہ کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لیے آپہنچا بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو، جگت اُستاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر اُستاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑ چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے، اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے بلعم باعور تھے، لیکن

[ل] آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں اسلئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی، تاج، کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

غزل اس کرّاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ان کی اُستادی کا سکّہ ایک زمانہ سے تمام دلّی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے اُستاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوگئی، وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے، اس لئے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

اُنھوں نے فوراً عرض کی:۔

نامناسب ہے میاں وقتِ سحر گاہ نہیں

کسی نے "وقتِ سحر گاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ اُنھوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقتِ سحر گاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اُڑایا ہے۔

اے خالِ رُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھکر

نواب صاحب نے اُن سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا، ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی، تشنہ چُم نشگے نشے میں چُور، جھومتے جھامتے اندر آئے، نوجوان آدمی ہیں مگر عجیب حال ہے، کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں

کسی کے شاگرد نہیں اور پھر، سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی اُستاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کر لی، مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بچارا مُنھ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے؟" کہنے لگے "اصلی رنگ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟" نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے، آپ بیٹھیے تو سہی، خیر ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے اُن پر ایک دوشالہ لاکر ڈال دیا، اُنھوں نے اُٹھا کر پھینکدیا۔ غرض جسطرح ننگے آئے تھے، اُسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا، جو آتا، اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لالا کر بٹھاتے، حکیم مومن خاں آئے، اُن کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اوّل ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں۔ اس لیے خود شعر نہیں کہتے، مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ اُن کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اُس کو دوام کی سند دیدیتا ہے، کوئی ۳۵ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں، مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے، مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے بچارے پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکّر میں آگئے

تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے، اُن کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے، انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی، اُن کو بہت غصّہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر اُن کی عزّت افزائی کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا[۱]۔

مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا، آداب کیا فرمانے لگے "میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا، سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا، خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔" میں نے عرض کی "مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا، یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے۔" فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے، چلو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اُترے۔ نیر، علائی، سالک اور حزین اُن کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر جان محزون کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے، معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر اُن کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں، دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

---

[۱] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یہ واقعہ اُن ہی کی زبانی معلوم ہوا اُسنکر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

نہ تو نامہ رہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا۔" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "اے لیجئے مرزا صاحب وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں۔" میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے، پورب کے رہنے والے ہیں، دہلی میں آکر حکیم آغاجان عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں، اُن کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ اُنھی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھی۔ سر مُنڈا کر نکو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹک بڑھی ہو گئے۔ انھی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور طائرالاراکین، شہیر الملک، ہُدہُدالشعرا، منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو اُن کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا، مگر بعد میں اُنھوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیئے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر سب کو اُن سے کچھ نفرت سی ہو گئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اُڑانے کے خود اُن کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ اُن کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود اُن میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے، تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ مُنھ آتے تھے۔ اسی لیئے مولانا صہبائی کے مُنھ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سُنکر مرزا نوشہ مُسکرائے اور کہا

کبھی میں تو اُن کے مُنھ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔ "ہر فرعونے راموسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹنک گئے تو میں سمجھونگا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ اُلٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور اُن لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے سیدھے کھڑے ہو کر داہاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا، باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی کلوں پہ ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے، شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہو گی۔ امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا[1] مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان

[1] اس مضمون میں جا بجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اُس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں، اُن کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی، نہ تاتاری، کلاہ کو (خواہ وہ سمور رہو یا برہ) اس طرح کا کیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے (بقیہ برصفحہ ۴۳)

شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انھی کو دیکھ لیجئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲)

ذرا بڑا ہے۔ اسکے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گٹرج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندشہ کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی، اندر استر دے دیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جسکو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اسکا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے کمرک (کمرخ) کے نمونے کے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور ان کے سلجانے کے بعد جو پہل پیدا ہوئے ہیں ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں، اس طرح بجائے چار پہل کی ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں خوبصورتی کے لئے دمے کے کناروں پر پتلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اسکے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ

جو شاہزادے لکھنؤ جاکر آئے ہیں اُن کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پیجامہ ہے جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پُرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳)

بائیں بھوؤں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا، نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چنٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے، برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں، اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چڑھاکر پہنی جاتی ہے، قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہے اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھاکر پہنتے ہیں۔

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیئے آستینیں بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اُلٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کُرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعے والوں کے انگرکھے

خفتان، پاؤں میں گلبدنی یا غلطے کا ایک بر کا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں اُنھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیر باد کہدیا ہے۔ چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلی کا شہزادہ کہدو لو تو کہدو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴)

کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے، بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر سموٗر لگا لیا۔ نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جسکو "عاشق معشوق یا چشمے" کہتے ہیں، اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قلعے میں تو اسکو خفتان کہا جاتا ہے، مگر شہر والے اس سینہ کھُلے نیمہ آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال سموسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی بتی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے مگر بہت کم۔ پائجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدنی، غلطے، مشروع موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر ہی کا پائجامہ پہنتے ہیں، مگر تنگ مہریوں کے پائجامے بھی چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جسکے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈھ، ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، مہندی ملکر باورچی خانہ میں لٹکاتے، یہانتک کہ اسکی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے، جسکو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، بنے ہوئے ڈنڈ، شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نکلیگا جسکو کسرت کا شوق نہو اور بانک، بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو، بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دیجاتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

اُستاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جسکو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے خیال میں اسکو نہ بیٹھنا چاہیئے تھا تو بجائے اسکے کہ اُس کو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا" وہ آکر اُن کے پاس پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے، اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جسکو وہ خالی جگہ کے موزوں سمجھتے اُس سے کہتے "تشریف رکھیئے وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لیئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام اُنھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "صاحب عالم ادھر آئیے"۔ کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے "بیٹھو، بھئی بیٹھو"۔ غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اُستاد اور اُن کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے، سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے۔ ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر

لگاکر چھوٹا سا گھر بنالیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بودی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں جہاں جاہا چھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اُڑادیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھلڑ سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی۔ اُنھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں، اُنھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوق کو آئے ہوئی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آپہنچے۔ اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی، چوگوشیہ ٹوپی جسم میں سانسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدنی کا پیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں اُن کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملاکر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اُترے[1] اور اُتر کے ایکطرف کھڑے ہوگئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اُترے، ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہوگئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیئے ہوادار کے پیچھے تھے۔ اُدھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اِدھر عصا بردار تو اُن کے سامنے آگئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیئے

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد اُن کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہوگیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)

اس سلسلے میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے
شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈالکر
کہا "اجازت ہے ؟" سب نے کہا "بسم اللہ، بسم اللہ" اجازت پاکر
یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے
کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا
"تشریف رکھیئے، تشریف رکھیئے" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے
اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا
بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر
جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے
بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجالائے اور دوزانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے
چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُن کے
اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اُٹھائے۔ ساتھ
ہی اہل مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے
خوشنوایانِ چمن دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن کے ہوتے
ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لاسکوں، صرف حضرت پیر و مرشد
کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے
بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ مجبوں! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو
معلوم ہے کہ اس کے لیئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت
آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے

لہ نواب فتح الملک بڑے کٹّے مسلمان تھے، کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے اسی لیئے سب
قلعے والے اُن کو "ملّا" یا "ملیٹا" کہا کرتے تھے۔

نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخرو مباہات کا دروازہ بند کردیا ہے، اُسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائینگے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے، لیکن اس مشاعرے میں، میں نے انتہا کو ابتدا کردیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اسکے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کرکے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دونگا۔" یہ کہکر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اُٹھا کر اُن کے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہکر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعیں لیجا کر لگنوں میں رکھدیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے بآواز بلند کہا

"حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے"

اس آواز کا سُننا تھا کہ ایک سناٹا ہو گیا۔ قلعہ والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر، تکیوں کے پیچھے رکھدیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اُگالدان، خاصدان اور بُن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لیئے ہوئے قلعے سے آیا۔ اسکے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی

"حاضرین! حضرت ظل سبحانی، صاحب قران ثانی خلداللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جاے!"

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے مُنہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پہ جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا، باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اُٹھایا۔ لیجئے آپ بھی پڑھیئے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زر افشاں، کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی، خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لیکر ادھر اُدھر دیکھا، ملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھکر کہا "صاحب عالم! ہمارا کیا منھ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف کر سکیں البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیجکر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزّت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اُس نے عرض کی "قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہ عالی میں پہنچا دونگا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہکر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اُس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سُنائی:۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے — مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے — عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے رکتے ہیں اشک — بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے واعظ وہ کب ہوتے ہیں صاف — اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعہ والوں کو برا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنیوالے لوگ ہیں۔ ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھ رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اُس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھدیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر اُدھر نظر ڈالکر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں، البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں"

۱۔ غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
۲۔ حال کھل جائیں غیر کے سارے — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
۳۔ درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
۴۔ وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف — تجھکو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
۵۔ شکوۂ یار اور زبانِ رقیب — کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا
۶۔ تم رہو اور مجمعِ اغیار — میرا کیا ہے، ہوا ہوا نہ ہوا

۷. پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُنکر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے، مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو انھی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزہ آگیا۔ استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانہ سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اُس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا، سامنے کی صف میں میاں پل کے آگے رکھدی۔ نام تو اُن کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ اُن کو میاں پل کہتا تھا۔ اُن کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا[1] کہ کسی پہلوان کو خاطر میں

[1] اس غرور ہی نے آخر اُن کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گذرا۔ شیخو والوں کے استاد حاجی علی جان نے ایک پٹھہ تیار کیا، بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ تھا مگر داؤں پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں پل نے حسب معمول شیخوں والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار پیترا بدل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں پل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کریگا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا استاد علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے؟ یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے

نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) میں آکر خم نہ ٹھونکنا" کہنے لگے "استاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟" استاد نے کہا "میاں جو جیسی کریگا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اسے بچل ڈالنا یہی ہوگا نا کہ بڑی پسلی تڑوا کر آیندہ کو کان ہو جائینگے، بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہوگئی، اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے، دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں پل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی، پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن، چادریں پھینک دنگل میں اترے۔ اترتے ہی دونوں نے "یا علی" نعرہ مارا۔ دو چار ڈھیکلیاں کھائیں، کچھ پڑھ کر مٹی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا، تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں پل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے وہ جھٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے۔ انھوں نے اسکا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤ زوری کر کے اس کو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اسکو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا انھوں نے ہفتے کس لیے۔ تھوڑی دیر تک اسکو خوب رگڑا وہ سہے چلا گیا انھوں نے پہلو میں اکسکر اس کا سینہ کھولنا چاہا، وہ بھی موقعہ تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں پل چاروں خانے چت جا پڑے لونڈا اچک سینے پر سوار ہوگیا۔ "وہ مارا۔ وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں پل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اٹھ چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے۔ تھے بڑے غیرتمند وہ دن اور آج کا دن، پھر ان کی صورت نظر آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

جواب میں اُن کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص ُیل، رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا، ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:۔

کہدو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اُس دبنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا خطِ سبز نے ساقی نے پشت دی مئے صافی کو بنگ سے

دل اب کے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں نکلے یہ کیونکر دیکھیے قیدِ فرنگ سے

آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا یاری تو تم نے کی ہے پِل اُس شوخ و شنگ سے

اُن کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اُٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی۔ یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں، کسرت کا بھی شوق ہے، نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی۔ اُدھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی۔ "اوڑھنی لاؤ"۔ ایک نوکر فوراً گہرے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے لٹے پڑے ناز و انداز سے اُس کو اوڑھا ایک پلّو کا بکل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑلڑ کر اور اُڑ اُڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نرت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لیئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا۔ مگر جو ریختے کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سُنتے رہے۔ غزل یہ تھی:۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جوان تا کا

بوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو

نہیں ڈرنے کی میں بھی، ہاں، نہیں تاکا تو اب تاکا

اگر اے نازنیں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے

چھریرا سا بدن، نام خدا ہے تیرے دولھا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا۔

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے اُستاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے، کہ سبحان اللہ، لکھا ہے:۔

فقط تو ہی نہ میرا اے بُتِ خونخوار دشمن ہے

ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبداللہ خاں 'اوج' کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پُرانے ۴۰، ۴۵ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی اُن کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خود ہی

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت
پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آ جائیگا

۱۴ رجب سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے مشاعرے میں شعرا کی نشست کا نقشہ

مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور ہیں اُکر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر اُستاد بھی اُن کو اُستاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتہ ہے جوان کو استاد نہ کہکر مفت کی لڑائی مول لے۔ اِدھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور اُن کے تیور بدلے۔ ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی، جب کہیں جاکر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی،

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا ۔۔۔ بے پُل صراط اُتریں، یہ ہے کمال اپنا

طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سے سرے نفرت ۔۔۔ سُم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نعل اپنا

کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل ۔۔۔ سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا

چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ موڑتا ہو ۔۔۔ (رکھکے) دیوی کے آستاں پر ہیں تھال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے۔ کہنے لگے "واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے، بھئی واللہ الفاظ "رکھکے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں اُستاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپّا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف "تمکین" کے سامنے آئی۔ اُن کی عمر کوئی ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی، مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے بات کرنے میں منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے غزل کہی تھی:۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا　　کس دل جلے کی یارخدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہوجیو ترا عشق بے حیا　　آئین کونسا تھا یہ کیا رسم وراہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا　　رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا　　جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا۔ اُستاد احسان نے کہا " میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے اُستاد رہے تو بھٹک نکلو گے " میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ " اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں، کل ہی انشاء اللہ اُستاد اوج کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں " اُستاد ذوق نے کہا " ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا، بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے " یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد ' تصویر ' کے سامنے پہنچ گئی۔ اُن کو میاں بتن بھی کہتے ہیں، الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے، بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آملے بھاری بدن، منڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی موچھیں، گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پائجامہ، اوپر سوسی ہی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بچارے نیچہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پُر گو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لیے جو جو کہتے دل و دماغ ہی میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے، کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی:-

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی

جان بے کار تو دینی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی

مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچیے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی

جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی، غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا "خاں صاحب یہ میاں ببّن بھی غضب کی طبیعت لیکر آئے ہیں، کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں، مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں ببّن وہ کیا شعر تھا؟ میاں ببّن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی — پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور شعر یہ تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں ببّن! یہ خدا کی دین ہے، یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اسوقت دل خوش کر دیا۔"

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، بہت دنوں سے دلّی میں آ رہے ہیں۔ بچارے گوشہ نشین آدمی ہیں

شاعری سے دلی لگاؤ ہے، کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے | توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو، پر اے تاباں | وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی۔ مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تاباں کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں، عبدالعلی نام ہے، مدراس کے رہنے والے ہیں کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدر آباد ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں، لکھا تھا

خم شراب سے خم کردو تو بن گیا | ساقی بنا دے مادہ پیالا اچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو | جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان آوج کے سامنے گئی، اُن کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہے | کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں | موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

اُن کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص

سلہ آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی جانب۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی او رچی بن کر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں :-

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے
یہ بات میں نے کہکر جب اس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں۔ ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سُنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جسطرح میں تعریف کرتا ہوں۔ دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر بُرا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے مُنھ سے بیساختہ واہ واہ نکلجائے آپ خود ہی اُن کا کلام دیکھ لیجیئے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پہ رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ اُن کے دل کو نہ لگی اس لیئے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔

ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے، زبان پہ جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ

کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم یہ سر، یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم کی باری آئی، ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی:۔

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے گیا اُدھر جو گزر پھر اِدھر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انھوں نے بہت تعریف کی، مگر اس کے ساتھ، یہ بھی کہا "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ اُن کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے، مگر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی، ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اُسمیں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اُٹھ شراب پی
اے جوشش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی۔ میں تو اب بھی یہی کہونگا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

اُن کے بعد مولوی امام بخش صہبائیؔ کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیزؔ تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں:-

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا

کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کیا ہوا
منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا

ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا
اسمیں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کیطرف لطف سے تھا صورت نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہئیے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوقؔ نے بھی کہا "بھئی صہبائی تمھارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے، خدا اسکی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام

پیدا کریگا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہوگیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ اُن کا کہنا ہے سرکار سے خطاب خانی پایا ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے، کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا، آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے، نہ آئیگا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہونگے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں　　　نو آسماں ہیں، دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کسکو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے　　　لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر　　　آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انھی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُترا جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر تعریف کے قابل تھا، غزل یہ ہے

ایک دن، دو دن، کہاں تک، تو بھی کچھ انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا

ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ ہیں
خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انساں ہوگیا

کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب
اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا

پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے " واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا، شعر کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بُتِ کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا"، غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سُناتے، مزے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش خاں تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے۔ بادشاہ سلامت اُن کو بہت عزیز رکھتے ہیں، میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ اُن کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سُنی، غزل بھی معمولی تھی، صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپِ غم
کہتا لوگوں سے بظاہر بُتِ عیار ہی کیا

رنگِ رخ زرد ہے، تر چشم ہے، لب پر دمِ سرد
پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین، اور وضع دار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں۔ اُن کا ایک شعر بڑے مزے

کا ہے۔

سبو سے منہ لگا ئینگے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھر یے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل اُنھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اُس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں | اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل
جل جل کے آخر ش تپشِ غم کے ہاتھ سے | اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سُنا نہ تھا | اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جبکا باپ شاعر، جبکا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہو گا تو اور کس کی غزل میں ہو گا۔ غزل تھی:-

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ | ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر | نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں، اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اسکو اب چھوڑتے جارہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار اُن کے

سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا، اُنھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھدے، اُس نے شمع رکھدی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں، کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کردی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا "ضرور فرمائیے" انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سُنائی:۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے	سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی	رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے	فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش	سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے ای تشنہ	فایدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے اِدھر یہ عالم طاری تھا، اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے مُنہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے"۔ شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا

کیا رنگ جمتا۔ اوّل تو یہ نو مشق ہیں، مرزا آقا و رحیم بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے او بتِ کافر اٹھا لیا — اس ناز کی پہ بوجھ، یہ کیونکر اُٹھا لیا

بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا

پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہرحال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ اُن کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہو گی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے، ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مار ا تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا:۔

۱۔ ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیِ دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

۲۔ شبِ وصال ہیں سُننا پڑا فسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

۳۔ وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے

۴۔ میرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھلکر ہو بیٹھے۔ اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، اُنھوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی، چشم کی، زلف دوتا کی — سہے ایک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بدل کر تمھیں بھی ڈر نہیں ہے کچھ خدا کی

ساری کی ساری غزل چپچپسی تھی، بھلا اسکی کون تعریف کرتا۔ ہاں اسکے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آگیا میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخرالشعرا نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا پھر کتاں وار جگر چاک ہوا
دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا کہیئے اس بت کو مشابہ کس کے
آہ کس وقت میں کیا یاد آیا عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بچارے بڈھے آدمی ہیں شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں اُستاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا اُستاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں، مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اُس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی غرض جتنے

استادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور اُنھوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھا شعر یوں کہتے ہیں" وہ بچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، اُن کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر اُنھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے اُن سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی، اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی ۴۲ سال کی عمر ہے، ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے عارف کے شاگرد ہیں، جہاں مشاعرے کی خبر سُنی اور دہلی میں آموجود ہوئے لباس تو وہی فوجی ہے، مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے، شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا ۔۔۔ وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں

ہاتھوں سے مزہ دیکھ ذرا جیب دری کا ۔۔۔ کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی

آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بیخبری کا ۔۔۔ جہلم کو عیادت کے لیے وہ مرے آئے

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی بچارے غریب صورت، فرسودہ لباس، کوئی ۶۴، ۶۵ برس کے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے، اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر کے قدم شریف میں جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے

کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر جڑی ہے حضرتِ دل ۔۔۔ پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی

جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ۔۔۔ ق ۔۔۔ تم گلے سے مرے لگو تو سہی

بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں ۔۔۔ خیر ہے کچھ، پرے ہٹو تو سہی

غیر کے کل وہ لگ کے چھاتی سے ۔۔۔ ق ۔۔۔ مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی

اس لیے اُس کے ہم گلے سے لگے ۔۔۔ کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور برے بھلے کی تمیز دشوار ہو گئی تھی، اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہو گئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلّی کے بعد شورہ نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں، قوم کے عیسائی ہیں اور نام جابج پیس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں، بہت غنیمت ہے۔ غزل:۔

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض ۔۔۔ دیکھے سے جسکے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی

بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا ۔۔۔ ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی

دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا ۔۔۔ جس طرف سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سُنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے

کہتے ہیں ۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے　　شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے

وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے　　رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھلکر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں، بعض اٹھے اور پانی کا چھینٹا منہ پر مار آ بیٹھے، کیسی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے، اُنھوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستادان فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا "میر صاحب یہ ٹھیک نہیں آپ تو بیچ میں آکر پڑھیئے"۔ یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دو شمعیں اُٹھا وسطِ صحن میں رکھدیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا، کونسا مشاعرہ ہے جو اُن کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں اُن کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ اُن کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں ہم نے تو جب سُنا اُن کا نام میر صاحب ہی سُنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔ بڑے سوکھے سہے آدمی ہیں، غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بٹیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، اونچا قد، غرض ان کے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا پتہ دے ۔ نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک برکا پائجامہ، سفید کرتہ اسپر سفید انگرکھا، سر پر ارخچین (عرق چین) ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب

غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا کوئی اُن سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ مُنہ پھر جائے اس سے اُن کو غرض نہ تھی کہ جواب بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک اُن کو چھیڑتے تھے۔ اُنھوں نے نہ اِن کا بُرا مانا نہ اُن کا، جواب دینے میں نہ اِن سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے، لکھکر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والی آسامی ہیں، چونکھا لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا۔ معترض کو ڈانٹا، میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سُن لیتا تو مدرسے سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب[۱] نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور

---

[۱] غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ انھی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کیے گئے۔ تذکروں میں تو اُن بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔

کہا "حضرات! میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا اپنے منہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہدہد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے" میاں ہدہد حکیم آغاجان عیش کے پٹھو تھے اور انھی کے بل پر پھدکتے تھے، اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں مجھکو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دیسکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ پڑا، میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں، بہت گھبرائے، ادھر دیکھا ادھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں" سب نے کہا "ہیں! میر صاحب! یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرمادیا، پڑھیئے میر صاحب! خدا کے لیے پڑھیئے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کرینگے تو غضب ہو جائیگا، زبان ادھوری رہجائیگی" میر صاحب نے کہا، "نابھئی نا میاں ہدہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے منہ پر کہتے، ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے، اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغاجان کے دم میں دم آیا انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر، قافیہ۔ اور "ہے" ردیف ہے۔ اسکے علاوہ میں تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ اُنھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہوگیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہوگیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحرِ طویل میں جا پڑا۔" میر صاحب نے کہا "مولوی صاحب کبھی بحرِ طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سُنی سُنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے، مطول[۱] جب معلوم ہوگا کہ بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں۔" مولوی صاحب بڑے چکرائے، کہنے لگے "میر صاحب! بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ، مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے کہا "مولوی صاحب! مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہوگئے۔ کہنے لگے "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اسکے دو دور کرتا ہوں، کل ہی اسکی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے میں لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے

---

[۱] علم معانی و بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو، اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے۔ یہ یہ بڑی اور یہ یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحرِ طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔" میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے، رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں؟" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہوے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھیے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے اُنھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہوئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں، بے مقطع کی یہ کیسی غزل۔" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے جسکو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

چاہیے کہ یہ غزل میری ہے، ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی" یہ کہتے کہتے اُنھوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اُٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھدی گئی یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے، لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ	قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا
ناصح کی بات سُننے کا کسکو یہاں دماغ	تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں	ایک پارسا، سُنا ہے کہ میخوار ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا، اسلئے اس غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی، یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پیجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے، آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے، غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ! واہ! کہتے ہیں:-

بزم اغیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے	ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اُٹھادے تو، تو ہی تو ہو جائے

کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا
چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

آپ انکار کریں، وصل سے میں درگزرا
کچھ تو ہو، جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے

ہو نہ ہو، بس میں کوئی، کچھ نہیں اسکی پروا
دل بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ، اللہ! در و دیوار سے بے خودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور اُستادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ مشوق کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے، گا کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبہ دل مضطر کہ تیر کا
باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں

کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے
ظاہر میں تو اکھی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دئے ہیں، آخر کیوں نہ ہو، قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید لباس، بغل میں انگوچھہ، کندھوں پر سفید کشمیری رومال بس جی چاہتا

تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائیے۔ شمع سامنے آئی تو اُنھوں نے عذر کیا کہ میں اب سُنانے کے قابل نہیں رہا۔ سُننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو اُنھوں نے یہ قطعہ پڑھا:۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت ۔۔۔ جو اُٹھ کھینچیں دامن، ہم اس دلربا کا
سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے ۔۔۔ کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ " نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی، لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ " نہ ہاتھوں میں طاقت" کہکر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے، جیسے کوئی بے دست و پا سر راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے، اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پہ جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منھ سے تعریف کے بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا۔ کہ " اللہ والی ہے بے دست و پا کا۔" اُستاد ذوق نے کہا " اُستاد! یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ! کیا مؤثر کلام ہے۔ ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لیئے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیئے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سُنتا، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے، اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں، پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدرالدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف ۔۔۔ کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا

سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت شکل کی   معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ربا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی،

۳۰-۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انہی کے ساتھ مشاعرہ میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ! ہائے لکھا ہے:-

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ   ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ   یہ خم ہے یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا، نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا، شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں، خوش ہو گئے۔ غزل یہ تھی:-

ترے بیمار ہجراں کا تیرے بن   یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے   مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں اُن کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کریگا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سُنی جاتی، اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ اُن کو دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک،

چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پہ چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی داڑھی، کلّوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال کوئی ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس اُن لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ مہری کا پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال، شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے بھی انگرکھے کی آستیں اُلٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ اودھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو اُنھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے؟" مرزا فخرو نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو، آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا، "عرض کیا ہے۔"

انتہا صبر آزمائی کی ہے درازی شب جدائی کی

ہے بُرائی نصیب کی، کہ مجھے تم سے امید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہ سائی کی

ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا نہ کرتا وصال شادیِ مرگ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی

راز کھلتے گئے مرے سب پر جس قدر اس نے خود نمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں بندے بندے میں بو خدائی کی

رہ گئیں دل ہی میں حسرتیں سالک آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد

ملتی۔ استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جیبہ سائی باندھتے آئے ہیں، تمھاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا، کیا کلام ہے، کیا روانی ہے، سبحان اللہ" حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمھاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو" میاں سالک نے جواب دیا، اُستاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا، دیکھیئے بڑھاپا دیکھنا بضیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہینگے مضمون رہ جائیگا۔"

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رُکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں مگر پھیکے، ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بتخانے میں تھا یا کہ میں کعبے کے قریں تھا	اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا	پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں	ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں اُن کے گانے میں مزا آ گیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی۔ اُنھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سُنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے

چاہیئے شاگرد ہیں، ابھی نو عمر ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔ غزل دیکھ لو اُستاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگانِ گلکدۂ آرزو و حاشا اگر بھیں سرِ سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بیٹا ہو چشمِ دل کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدحِ موج خیز رنگ وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
گل چور کل ہے سنگِ جفائے سپہر سے گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تندبادِ حوادث سے خاک و خوں گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز اُس جا پہ آج دل شکن آواز زاغ ہے
مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم علائیا کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھلکر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزا۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی، نہ مضامین میں کوئی خوبی، تعقیدوں سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی، اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

بازآ، ستا تو مجھکو بہت عشوہ گر نہیں کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں
گو نزع میں ہوں ہیں ترے بن آئے جانِ من کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں، لکھا تھا:۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل ہیں مضمر ہیں معنیٔ باقی　　کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصے نے ایک دم میں کیا　　مُردہ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیر رخشاں　　اپنے ہی گھر میں ہو وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں، بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے، شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے، اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی، لکھا تھا:-

بسانِ طائر رنگ پریدہ وحشت سے　　کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، اگر ہم　　یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گُندھی تھی کوئی بدستِ تشنہ لب کی وہ خاک　　کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب جانے کا
بذوق ناز کو دے رخصت جفا کہ یہاں　　ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہی جنکو راز و نیاز　　اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہوا اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا، بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا، اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی:-

اُٹھتا قدم جو آگے کوائے نامہ بر نہیں　　پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں　　خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں　　اپنے ہی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی، اُستاد احسان نے کہا "میاں عارف!
میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہوگیا ہوں، لاکھوں شعر سُنے، لاکھوں سُنائے، مگر
یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہوگیا۔"

میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے
سامنے آئی، یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے
ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہونگا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے
شاعر ہوں گے۔ غزل تھی

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے ۔۔۔ حشر سے پہلے میسّر ہو وہ دیدار مجھے
کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ ۔۔۔ دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے
جنسِ دزدیدہ کے مانند ہوا الجھاؤ میں جان ۔۔۔ کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے
رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور، کہ یاں ۔۔۔ کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع
ہوئیں، حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ
اور لباسِ کمال سے پیراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام
شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُسکرا رہے ہیں، طبیعت ایسی
ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد، خوش اندام،
سر پہ ایک ایک اُنگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سُرخ و سفید
رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کُرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا
ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔
میاں ہدہد کو پال کر اُنھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اسکی واہی
تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا، لیکن جب اس نے اُستادوں پر حملے

شروع کیے۔ اس وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہوگئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود اُنھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کردیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر اپنے ساتھ ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا؟" مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے۔" بہرحال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہدہد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا تھا وہ سن چکے تھے، اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی

صلح اُن سے ہمیں کیے ہی بنی دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے ہاتھ سے اسکے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش اُن جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلّ علی کے شور اور سبحان اللہ، کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سُننے والوں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دور کردیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہوگئے جو پہلے

تھے، نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہد ہد کچھ چہک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہوجاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا اُنھوں نے پہلے ہی اس پکھیرو کی زبان بندی کردی۔ خیر رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی اُن کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں، شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی، اب اپنا کلام استاد ذوق کو دکھاتے ہیں شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں، پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کردیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے	رنج مرنے کا مجھکو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے	اے اجل جلد آکہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا	ظلم کرنا تمھاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخت بدوش	ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے	دم نکلتا نہیں مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ	آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مؤنث باندھ گئے"۔ حیا نے جواب دیا۔ "جی نہیں قبلہ میں نے تو استاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں "سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"۔ بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے۔ "بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث"۔ بچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں ہزاروں شاگرد ہیں، اکثر ریختہ کہتے ہیں، ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں، مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی اُن کی کوئی غزل دیکھی نہ سُنی۔ اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم	محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مردم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت	من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست	جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد جور و من در ہجر دوست	داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباش	مے زخونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے مُنہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرے

---

[1] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہا ہا ہا! زبان کا لطف اُٹھانا ہے تو نواب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیرؔ کو سنیئے۔ ابھی ۳۰، ۳۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ، اُستاد ذوقؔ کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول داڑھی، نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی:۔

جبیں، اور شوق اسکے آستاں کا — ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری درماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رہے پابند ول کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا
ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دلِ بیتاب نے وہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیرؔ! آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور اُستادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے

کی طرح کھل گیا، تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہونگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ اُن کا کیا کہنا۔ یہ اُستادانِ فن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود اُستاد ہیں۔ اُنھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ سُنکر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سُنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی، انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی :-

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ　آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول　کیا فائدہ ہے، موج اگر ہے سراب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے　جوں آفتاب، روشنیِ آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا　وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
بیباک شیوہ، شوخ طبیعت زباں دراز　ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور　اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب اُستادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت

زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے اُنھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کردیجائے تو اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جسکو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اسکی تعریف ہونی چاہیئے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف، اور وہی داد بھی دیتے ہیں، مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے، کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں، اور اُن کے لیئے یہ غزلیں اُستاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے، ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود اُن کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے، شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے، یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و ممنون
ہوئی احساں سے پر اصلاح طبیعت میری

پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض
طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری

اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب
اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری

ہند کا فضل و ہُنر ذات پہ ہے جن کی تمام
مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری

منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا
کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر اُن کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے، مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا شہر اُن کو اُستاد مانتا ہے، ہونگے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی:۔

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں، میں تو اس لبِ میگوں کے سامنے — نامِ شراب لے کے گنہ گار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہِ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہِ رخِ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کردہ گنہ گار ہو گیا
اسکی گلی میں آن کے کیا کیا اُٹھائے رنج — خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔

اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہوتے۔ اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ اُن کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پایہ کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا نیچی ہے لیکن اُن کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے، تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں، ہاں مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو! کیا پختہ کلام ہے:-

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں — کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
شب اُسکو حالِ دل نے جتایا کچھ اسطرح — ہیں لب تو کیا، نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اُس سے کچھ میں، نکلتا ہے منہ سے کچھ کہنے کو یوں تو ہیگی زبان اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہوگئے۔ ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن لطف سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں لطفِ عمر دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ، اللہ، وہ سُہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھولی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہوگیا ہو، اور

کوئی نہ تھا جسکے مُنھ سے جزاک اللہ، سُبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے الفاظ بیساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہوگئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی۔ اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختے کے اُستاد کے کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہوگئے اُنھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چُنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنّم کے ساتھ یہ غزل پڑھی:۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اُس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی، بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے، وہ خود بھی اپنے کلام مزا لے رہے تھے۔ جس شعر میں اُن کو زیادہ لطف آتا تھا اُسکو پڑھتے وقت اُن کی اُنگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دیکر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے

تھے، اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سُنکر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں

تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ

اُن کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پہ چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو اُنھوں نے متوجہ کیا۔ اسکو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی اُستادی کی داد دینی چاہئی کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مُرصّع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دل محزوں — نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رُلائے خدا

بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب — خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا

رضا یہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف — جو اس پہ تو نہیں راضی، نہ ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان — یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی، شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہکر ایسے دلکش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل سرد ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پر درد تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو

اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی:۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ — مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا "اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر اُن سے خدا سمجھے"۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے"۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاد ذوقؔ کے سامنے پہنچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی، شب ہجر کا مزا آ گیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں"۔ مرزا فخرو نے کہا "اُستاد! آج کا مشاعرہ سب بندوں

سے آزاد ہے۔ غزل پڑھیے، رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیے۔ غرض جو دل چاہے پڑھیے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور۔" استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تپ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جاں پہ ترے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھائیے سوہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے بانی جو اپنے منہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھکو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بروقت بولا — تیری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی :-

"اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے مُنھ سے نکلا۔" تیری آواز مکے اور مدینے"۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا" صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے"۔ یہ کہکر اُنھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر اُن کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا تھا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی" حضرات مشاعرہ ختم ہوا"۔ یہ سُننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہوگئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر سب ایک کر کے رخصت ہوئے۔ آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے" میاں کریم الدین! یہ تمھاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بہ خیر و خوبی ختم ہوا۔ تمھارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا اچھا خدا حافظ"۔

تتمہ

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے روز سب سامان اُٹھ گیا۔ اور پھر دہی چھاپے خانہ کی گھڑ گھڑ

اور پریسمینوں کی گڑبڑ شروع ہوگئی۔ میں نے دو تین مہینے پھر مشاعرہ کا اعلان کیا، اشتہار بھی تقسیم کیئے، مگر گنتی کے آدمی آئے۔ آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی۔ کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے، غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکا نے مجھ سے فریب کر کے مطبع چھین لیا۔" ہر چند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا، لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا۔" اس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں اور کون چھاپتا ہے۔ فقط

میں چھاپتا ہوں میرزا صاحب اور لیجئے یہ چھاپ دیا۔

حسن نظامی

جو مغلوں کے آخری شہنشاہ ابوظفر بہادر شاہ پر بالزام بغاوت چلایا گیا تھا۔ اور جس کی پیشیاں مدت تک ہوتی رہیں۔ ہندو مسلمانوں کی گواہیاں ہوئیں۔ خود بہادر شاہ کا بیان ہوا۔ اور دوران مقدمہ میں ایسے عجیب و غریب خفیہ راز منکشف ہوئے جن کا حال کسی کو معلوم نہیں تھا۔ غرض یہ کتاب شروع سے آخر تک واقعات کا تاریخی حسرتناک مرقع ہے۔ اور اس واسطے ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ از حضرت خواجہ صاحب قیمت دو روپے (عہ) +

غدر دہلی کے افسانوں کا پانچواں حصہ

گرفتار شدہ خطوط

اس مجموعہ میں وہ خط و کتابت شائع کی گئی ہے جو غدر ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ بادشاہ اور غدر کرنے والوں کے درمیان ہوئی اور جس کو قلعہ دہلی سے انگریزوں نے گرفتار کیا۔ ۱۵۲ صفحہ کی کتاب ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ لکھائی اور چھپائی بھی۔ اس کتاب سے غدر کی تمام خفیہ کارروائیاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اور غدر کے ہر ممبر کا طرز عمل علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے نہایت دلچسپ ہے اور نہایت موثر ہے از خواجہ صاحب قیمت عہ

غدر دہلی کے افسانوں کا چھٹا حصہ

غدر دہلی کے اخبار

یعنی غدر ۱۸۵۷ء کے ان اخبارات کے اقتباسات جو زمانۂ غدر اور اس سے پہلے شائع ہوتے تھے اور جن پر انگریزی گورنمنٹ نے یہ الزام لگایا تھا۔ کہ بغاوت کرنے میں ان مضامین کا دخل بھی تھا۔ اب ان سب کا مجموعہ ایک جگہ شائع کیا گیا ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحہ۔ لکھائی چھپائی نفیس کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا۔ از حضرت خواجہ صاحب قیمت ۸ر

غدر دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصہ

غالب کا روزنامچہ غدر

یہ اسی صفحہ کی کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ اس میں شاعری کے آفتاب نواب اسد اللہ خان غالب کی تحریریں احوال غدر کے متعلق جمع کی گئی ہیں۔ اور غالب کی مشہور تاریخ غدر "دستنبو" کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایک تو بیان غدر اسپر غالب کا طرز ادا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ منہ سے بول رہے ہیں۔ نہایت دلچسپ۔ بہت عبرت انگیز